شیبا عالم
ریسرچ سکالر، شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

''چلتا مسافر'' آج کے تناظر میں

Sheeba Alam

Research Scholar, Urdu Deptt. Islamia University, Bahawalpur.

'Chalta Musafir': in Recent Perspective

The novel "Chalta Musafir" by Altaf Fatima deals with a very sensitive human issue about the plight of Behari Muslims stranded as a homeless community after the creation of Bengla Desh. Unfortunately history decided it's journey on the basis of those events which took place just after the partition. After 1971 war Behari Muslims faced a strange situation in which they were neither accepted by Bengalis nor by Pakistan, which they still call their homeland. They still are waiting for some decision about their fate. This issue needs to be addressed and "Chalta Musafir" is a bold comment in this reference.

اُردو ناول نگاری کی روایت میں ہندوستان کے مختلف تہذیبی اور ثقافتی علاقوں میں آباد مسلم اشرافیہ کی زندگی کے تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی مزاج کے گوناگوں پہلوؤں نے اپنا بھرپور اظہار کیا ہے۔ خاص طور پر 1857ء کے بعد کی تبدیل ہوتی ہوئی سیاسی، سماجی اور معاشرتی تاریخ میں مسلم اشرافیہ کی ذہنی، فکری اور جذباتی رویوں کو کئی سطحوں پر پیش کیا گیا ہے۔ اردو ناول نگاروں نے ہندوستان میں بسنے والی دوسری اقوام کو خاص طور پر اپنا موضوع نہیں بنایا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 1857ء کے بعد شاید سب سے زیادہ متاثر ہونے والا طبقہ مسلم اشرافیہ ہی سے متعلق تھا۔ اگر اس پہلو پر غور کریں تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ اس تاریخی واقعے کے نتیجے میں جو تہذیبی اور معاشرتی تبدیلی ہندوستان کی مسلم ریاستوں میں بالخصوص پیدا ہوئی اس کا بنیادی سروکار ہی مسلمان خاندانوں سے تھا۔ اس لئے یہ مطالعہ کئی لحاظ سے اس انقلاب کو سمجھنے کے لئے ضروری قرار پایا۔ سوائے قرۃ العین حیدر کے ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' کہ جس میں مسلمانوں معاشرت کے تناظر میں عیسائی اور ہندو معاشرت کے کرداروں کو مرکزی حوالہ بنایا گیا ہے۔ وگرنہ اردو ناول کی روایت میں صرف مسلم اشرافیہ کے آشوب سے لے کر ان کے داخلی اور ذہنی اضطراب سے پیدا ہونے والی حقیقتوں کو ہی معنویت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو خواتین ناول نگار و افسانہ نگاروں نے ہندوستان کی مسلم اشرافیہ کی گھریلو زندگی کے تہذیبی، ثقافتی اور لسانی رشتوں کے مزاج کو کئی پہلوؤں سے اُجاگر کرنے کی

کوشش کی ہے۔اس پوری روایت میں اس ایک پہلو کے حوالے سے اردو ناول میں ہر زمانے کی اخلاقیات، معاشرت، خاندانی مزاج، ثقافتی اور معاشرتی تفاصیل پوری جزئیات کے ساتھ دستاویز ہوگئی ہیں۔لیکن اسی حوالے سے یہ بھی دیکھنا ہے کہ کیا یہ تفاصیل ناول کا مرکزی نقطہ بنتے ہوئے اپنی افسانوی معنویت بھی پیدا کرتی ہیں یا نہیں۔اس حوالے سے ایک رائے ملاحظہ کریں۔ہیگل کے نظریۂ تاریخ کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> ''تاریخ میں واقعات کا انبار، ان کی تراش خراش، کتر بیونت کانٹ چھانٹ اور ترتیب، معلومات کا ایک ذریعہ تو ہو سکتے ہیں لیکن محض واقعات کوئی تاثر اور کوئی شعور واحساس پیدا نہیں کرتے۔اس لئے شعور واحساس کو پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ واقعات کے پس منظر میں جو اسباب، وجوہات اور حالات ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے۔ان پر تنقید ورائے زنی کی جائے ان کی اصل روح کو سمجھا جائے اور پھر واقعات کے سلسلہ اور ترتیب کو دیکھا جائے تو اسی صورت میں تاریخ افادیت کی حامل ہو سکتی ہے۔''(۱)

اس اقتباس سے تاریخی مواد اور ناول کے تخلیقی اور فنی مراحل کے اختلاف سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ ناول نگار اپنے تاریخی شعور کی بنیاد پر اپنے ناول کے مواد کو ایک تخلیقی مزاج میں ڈھالنے کی تکنیک اور تجربہ شامل کرتے ہوئے اُسے آنے والے زمانوں کے لئے ایسی تعبیر دے دیتا ہے جو ناول کو ہر زمانے کے لئے بامعنی بنا دیتا ہے۔ایسے ناول نگاروں میں ایک ایسا نام بھی ہے جس پر نقادوں اور محققین نے کم توجہ دی ہے وہ نام ہے الطاف فاطمہ کا جن کی اصل شہرت ان کے ناول ''دستک نہ دو'' کے حوالے سے ہوئی لیکن ان کا ایک ناول ''چلتا مسافر'' آج ایسی معنویت پیدا کر رہا ہے کہ ہمیں اس پر غور کرنے کی نہ صرف ضرورت ہے بلکہ تاریخ کو زندہ سمجھتے ہوئے اس کی تعبیر بھی ضروری ہو جاتی ہے۔''چلتا مسافر'' 1981ء کو منظر عام پر آیا اور اس ناول کا موضوع ایسا ہے جو انسانی آشوب میں دردناک تاریخی حوالوں کو لئے ہوئے ہے۔جبکہ یہ ناول قیام پاکستان سے پہلے کی تاریخ سے اپنا آغاز کرتا ہے۔

الطاف فاطمہ لکھنے والوں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جنہوں نے قیام پاکستان سے پہلے لکھنے کی تربیت حاصل کی اور پھر اپنے طبقے کے مزاج کو بڑی خوبی سے کہانی میں ڈھالنے کا فن حاصل کیا۔وہ مسلم اشرافیہ کی خاندانی قدروں کو نہ صرف سمجھتی ہیں بلکہ ان کے اظہار کا سلیقہ بھی رکھتی ہیں۔قیام پاکستان سے پہلے کے مسلمان گھرانوں کی معاشرتی، معاشی، نفسیاتی اور جذباتی زندگی کے مختلف زاویوں کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔

الطاف فاطمہ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں رہنے والے مسلم گھرانوں کے مزاج سے بھی واقف ہیں۔یہ واقفیت محض رسمی یا معلوماتی سطح پر نہیں ہے۔بلکہ اُن کے رہن سہن، روایات، عقائد، سوچ کے انداز اور ان کے مشاغل کا گہرا شعور بھی موجود ہے۔ان کے دونوں ناول ''دستک نہ دو'' اور ''چلتا مسافر'' اپنے تہذیبی، تاریخی اور سیاسی شعور کی وجہ سے بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔''دستک نہ دو'' جو تاریخی اعتبار سے تو اہم نہیں ہے البتہ مسلمان گھرانوں کی تہذیب کے حوالے سے اس پر نقادوں نے گفتگو کی ہے۔اس میں اہم بات یہ تھی کہ 1947ء کے بعد ہجرت کرنے والے مسلمان گھرانوں کے ایک اہم المیے پر ضرور روشنی ڈالی گئی ہے۔جو خاندانی رئیس پاکستان میں ہجرت کر کے پہنچے وہ اپنی شرافت کے باعث اپنی جائیدادوں کے کلیم داخل نہ کر سکے اور محروم رہے۔

تاریخی شعور کے حوالے سے اُن کا ناول ''چلتا مسافر'' اپنے موضوع اور تکنیک کے حوالے سے آج بھی اتنا ہی بامعنی ہے جتنا اُس وقت تھا۔ بلکہ آج اس مسئلے نے اور بھی سنگین صورت پیدا کر دی ہے۔ اس لئے اس ناول کو آج کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ جو ناول اپنے عصری واقعات کی ترتیب میں لکھا جائے اس میں مورخ کا کردار کس حد تک ناول نگار سے مختلف ہوگا اور ناول نگار اس مواد کو کس حوالے سے اپنی ذات کا حصہ بنانے کے بعد سوالات پیدا کر کے ان کی تعبیر حاصل کرے گا۔ ایک رائے ملاحظہ کرتے ہیں۔

> "History proceeds by the iterpretation of evidence: where evidence is a collective name for things which singly are called documents, and a document is a thing existing here and now of such a kind that the historian by thinking about it can get answers to the questions he asks about past events"(2)

الطاف فاطمہ کے ناول ''چلتا مسافر'' نے بھی اس رائے کے مطابق بہت سے سوالات اُٹھائے ہیں۔ جن کا ہم جائزہ لیں گے۔ یہ ناول بنگال کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے فضل احمد کریم فضلی کا ناول ''خونِ جگر ہونے تک'' اور قرۃ العین حیدر کا ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' اپنے اپنے موضوعات کے اعتبار سے بنگال کے تہذیبی تناظر کو پیش کرتے ہیں لیکن اس ناول کی معاشرت اور طرزِ احساس ان دونوں سے بہت مختلف ہے۔

''چلتا مسافر'' میں پاکستان بننے کے بعد بنگال میں 1971ء تک حالات میں تبدیلی آئی اور ان کا براہِ راست تجزیہ تو نہیں ملتا۔ مگر سیاسی اور سماجی حالات میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں وہ پس منظر میں اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ پیش منظر میں کرداروں کے حوالے سے وہاں پر اُٹھتے ہوئے ہر مسئلے کو ایک انسان دوست رویے کے تحت لکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام انسان جو سیاست میں زیادہ دلچسپی نہ بھی رکھتا ہو۔ سقوطِ ڈھاکہ میں پیش آنے والے عوامل سے آگہی حاصل کر لیتا ہے۔

1947ء میں بہار سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آنے والے خاندانوں کو بنگال کی زمین کے بیٹوں نے مختلف تہذیب و زبان کے باعث قبول نہ کیا اور انہیں مسلسل اجنبی کی طرح رہنے پر مجبور ہونا پڑا۔ نہ وہ بنگالی زبان اپنا سکے نہ بنگالیوں نے ان کی زبان سمجھنے کی کوشش کی۔ دونوں میں مغائرت نے کئی طرح کے تہذیبی اور معاشرتی مسائل کو جنم دیا۔ آج یہ مسئلہ اُسی طرح موجود ہے۔ بلکہ 1971ء میں مشرقی پاکستان کے ختم ہونے کے بعد وہ اس خلاء میں معلق ہیں کہ نہ تو پیچھے جا سکتے ہیں اور نہ موجودہ پاکستان انہیں اپنانے کے لئے تیار ہے۔

ناول کا آغاز ہندوستان کے علاقے بہار کے ایک زمیندار مسلمان گھرانے کی زندگی سے ہوتا ہے۔ جہاں ہندو مسلم کشیدگی پاکستان بننے سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ یہاں الطاف فاطمہ نے مسلمان گھرانے کے روشن خیال رویوں کو اس لئے واضح کیا ہے کہ اُن کے ساتھ ہونے والے تعصّبات سے اُن کی مظلومیت کو اور واضح کیا جا سکے۔ یہ مسلم گھرانے پنجاب سے آنے والا رشتہ بھی قبول کرتے ہوئے بیٹی کو پنجاب بھیج دیتے ہیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کو دل و جان سے

قبول کرتے ہیں۔اس طرح کی یگانگت ہندوستانی مزاج کے عین مطابق تھی اور الطاف فاطمہ اس مزاج کی ماننے والی ناول نگار ہیں۔ یہ خاندان بہاری مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ جنہوں نے پاکستان کی حمایت میں ہر طرح کی ہجرت قبول کی تھی اور باپ یہ کہتا ہے کہ میری یہ بیٹی پاکستان کے لئے ہراول دستہ ہے جو امرتسر میں بیاہی جارہی ہے۔

''شکار کے دوران امیر حیدر نے ایک بار پھر سید صاحب کو سمجھانا چاہا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔امیر حیدر، تم سمجھتے ہو میں یا بہار کے یہ تمام بڑے زمیندار اور مقتدر گھرانے نتائج سے بے خبر ہو کر پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں۔ ہم کسی خیالی جنت میں نہیں بیٹھے ہیں۔ یہاں پر ہماری تہذیبی اور مذہبی زندگی کی آبرومندانہ ضمانت اب اسی صورت میں ملے گی کہ جب مسلم اکثریت کے صوبوں کو حق خودارادی مل جائے گی۔ ہمارے جماعتی اور ملی وجود کی یہی ایک ضمانت نظر آتی ہے۔''(3)

ناول میں اس خاندان کے ذریعے ہم ہندوستان کی تقسیم کے اس عمل سے گزرتے ہیں جو اس زمانے کے دوسرے ناولوں میں بھی ملتا ہے۔الطاف فاطمہ نے تہذیبوں کے ملاپ کے ذریعے پاکستان کے حق میں مختلف علاقوں کے رہنے والوں کو آپس میں یک آواز دکھایا ہے اور یہ اس ناول کی منفرد بات ہے۔اور جب پاکستان کے قیام کے سلسلے میں صورت حال بگڑنے لگتی ہے تو یہ کسی کو معلوم نہیں ہو پاتا کہ امرتسر پاکستان کے پاس جائے گا یا ہندوستان کے پاس۔ یہ اس خاندان کے لئے انتہائی جذباتی معاملہ بن جاتا ہے کیونکہ بہار سے اس خاندان کی بیٹی امرتسر بیاہی جاتی ہے۔اس حوالے سے یہ ناول ہندوستان کی تقسیم کے ایک منفرد زاویے کو پیش کرتا ہے۔

''یہاں امرتسر میں ایک عجیب سا عالم ہے۔ کچھ عجیب طرح وقت گزر رہا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ پاکستان کی حد بندی کی کیا صورت ہوگی اور اسی وجہ سے شہر کی فضا میں تناؤ سا آ گیا ہے۔ پورا ماحول جیسے بھڑوں کا چھتا بن گیا ہے۔دونوں طرف گھروں میں اسلحہ رکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔''(4)

الطاف فاطمہ کا یہ ناول بنیادی طور پر سیاسی نہیں ہے۔تاریخی حوالے سے تہذیبی اور انسانی آشوب کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ان کا سروکار تاریخ کی کروٹوں میں کہیں موجود ہے۔اس لئے اس ناول کو بے حد اہم سمجھا جانا چاہئے تھا۔اگرچہ اسے قاری بہت ملے لیکن نقادوں نے اس پہ زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ ایسے بھی کہا جا سکتا ہے کہ تحریکوں کی گھن گرج میں کچھ تخلیقی کام ایسے بھی ہوتے ہیں جو نظرانداز ہو جاتے ہیں اور کچھ ادیبوں کے گروہی کلچر کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔اس ناول میں مسلمانوں کے اس عہد کے عمومی جذبات کی ترجمانی حقیقی بنیادوں پر کی گئی ہے۔انگریزوں کے خلاف آزادی کی لہر تو سب قوموں میں موجود تھی۔اس حوالے سے بہاری مسلمانوں کے کیا جذبات تھے اس ناول میں اس طرح بیان ہوئے ہیں۔

''تم کیا، یہ تو بڑے بڑوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ جوں جوں آزادی کی تحریکیں بڑھیں گی اور انگریز اپنے قدم اکھڑتے محسوس کرے گا فساد کروائے گا۔''(5)

الطاف فاطمہ نے جو تاریخی شعور دیا ہے وہ یہ بتاتا ہے کہ انگریز جاتے جاتے فسادات کرا جائے گا اور یہی بعد میں حقیقت بن گیا کہ انگریزوں نے ایسا بیج بویا کہ ہندوستان آزادی کی نعمت سے فیض یاب ہونے کے بجائے خون میں نہلا دیا گیا۔اگرچہ ''چلتا مسافر'' محض اس موضوع تک محدود نہیں ہے۔ناول کا سروکار بنگال ہے جہاں اس کہانی نے بسیرا کیا ہے اور پھر یہ ناول مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بننے کے مراحل سے گزرتا ہے۔اس حساب سے الطاف فاطمہ کا تخلیقی تجربہ ایک بڑے ناول نگار کا

ہے۔اس ناول کا زمانی وقفہ اور کینوس پھیلا ہوا ہے اور یہ ناول نگار کی تخلیقی قوت کا آئینہ دار ہے۔

ناول کا موضوع مشرقی پاکستان میں بہاریوں کے مستقبل کے حوالے سے انتہائی حساس اور انسانی حقوق کے اہم مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ناول کا عنوان ''چلتا مسافر'' اسی حوالے سے معنی دیتا ہے کہ بہاریوں کا اصل وطن کون سا ہے' کس زمین کو وہ اپنا کہیں۔مشرقی پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے یہ مسلمان بہار سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آتے ہیں کیونکہ انہیں ہجرت کر کے اپنے الگ وطن کے مطالبے کے نتیجے میں وہاں جانا پڑا لیکن وہاں کے حالات میں بھی وہ زبانوں اور تہذیبوں کے اختلاف میں اپنی شناخت کو تلاش نہ کر سکے۔مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش تک کا سفر عجیب حیرتوں کا سفر ہے کہ وہ بنگالی نہ ہونے کی وجہ سے تحلیل ہو رہا تھا یوں ان کی شناخت بھی تحلیل ہو رہی تھی۔بنگالی تو اپنی زبان' کلچر اور زمینی شناخت کی وجہ سے اپنے حقوق کے لئے لڑنے میں حق بجانب تھے لیکن بہاری مسلمان کس بات کی جدوجہد کرتے۔المیہ مشرقی پاکستان کا یہ ایک ایسا تاریخی اور سیاسی پہلو ہے جس پر کم لکھا گیا ہے کہ یہ لوگ چلتے مسافر ہیں جو بہار سے مشرقی پاکستان اور پھر مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے کے بعد پاکستان کی طرف ہجرت کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں پاتے۔اس طرح ''چلتا مسافر'' گویا اپنی شناخت اور اپنے وطن کی تلاش میں مسلسل بھٹک رہا ہے۔زبان ایک اہم مسئلے کے طور پر ان کرداروں کو اس سرزمین پر اجنبی بنا دیتی ہے۔ناول میں مدثر جو بنگال میں پیدا ہونے والی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور بنگلہ بولتا ہے مگر اپنے ماں باپ کے بہاری ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کیا جاتا۔

> ''مدثر اردو میں انگریزی کے لفظ ملا کر نہ بولا کرو۔'' مزمل نے ٹوکا۔میں نے تم سے کئی بار کہا ہے۔
>
> ''مگر میرے لئے تو دونوں زبانیں ہی Alien ہیں۔میں اردو کی سطریں درست نہیں لکھ پاتا۔''(6)

اسی طرح بنگالیوں کے لئے اپنی زبان کے حق کا مسئلہ اہم ہو رہا تھا۔اردو زبان کو وہ حاکم کی زبان سمجھنے لگے۔جب مغربی پاکستان کو انہوں نے اپنے حقوق غصب کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا تو بہاریوں سے ان کے فاصلے بڑھنے لگے۔بہاری دراصل مغربی پاکستان سے بنگالیوں کی نفرت کا نشانہ بننے لگے۔یہ ایسا پہلو ہے جس نے الطاف فاطمہ کے تاریخی اور تہذیبی شعور میں اپنی جگہ بنائی اور پھر وہاں پر موجود مختلف کلچر اور ثقافتی بنیادوں کو سمجھنے کے لئے ناول میں کرداروں کے مختلف رویوں سے کام لیا اس طرح مختلف ''کلچرز'' کو ایک جگہ پر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو جگہ بناتے ہوئے انہوں نے یہ آگہی دی کہ دو کلچر کیسے اپنی اپنی جگہ بناتے ہیں۔مغربی پاکستان کی بات کرتے ہوئے ایک بنگالی کردار کہتا ہے۔

> ''میں سوچتا ہوں' ادھر مغرب میں دو کلچر ہارمونائز ہو رہے ہیں۔ہاں میں یہی کہہ رہا ہوں کہ کلچرز کا Harmonisation ہو رہا ہے۔یوپی اور دلی کی عورتیں غراروں پر کڑھے ہوئے گلوں کے کرتے پہنتی اور میٹھے پان کھاتی تھیں اور اب پنجاب کی لڑکیاں شلواروں پر کڑھے ہوئے گلوں کے کرتے پہنتی اور میٹھے پان کھاتی ہیں۔میٹھا پان' یاد ہے نا بابا۔ادھر جب ہم کنونشن میں لاہور گیا تھا ہم نے مولا بخش کی دکان کا میٹھا پان۔وہ ایکدم حسب عادت جذباتی ہو گیا۔تم لاہور جاؤ گی تو مولا بخش کو میرا اسلام بولنا۔''(7)

مگر افسوس کہ کلچرز کی یہ Harmonisation مشرقی پاکستان میں بہاریوں اور بنگالیوں کے درمیان نہ بن پائی۔الطاف فاطمہ نے گو کہ مذلل اور بذلل کے باہمی انسانی رشتے سے یہ اختلاط دکھایا ہے مگر وہ ذاتی سطح پر نظر آتا ہے۔لیکن اوپر کی سطح پر

وہاں کے معاشرے میں بہت سے تعصّبات کو بھڑکایا گیا بلکہ جو تضادات پاکستان کی قیادت نے پیدا کئے یا سیاسی ابتری کے حالات نے پیدا کئے وہ کسی سے سنبھالے نہ سنبھل سکے۔ بہاری بنگالی کے رہن سہن میں فرق ہوسکتا تھا لیکن دونوں میں غربت اور وسائل کی کمی کے نتیجے میں معاشرتی اور معاشی حالات کی سطح تو ایک جیسی تھی لیکن یہ سطح ایک جیسی کب تک رہتی جب لسانی تعصّبات کے ساتھ ساتھ ثقافتی مزاجوں کے تعصّبات بھی راہ پانے لگے تو دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ زبان دراصل صرف مطلب براری کا ذریعہ نہیں ہوتی۔ زبان میں صدیوں کی تاریخ گھلی ملی ہوتی ہے اور اس تاریخ میں ان کی رسومات، روایات، اسلوبِ زیست اور ثقافتی اظہار بھی تو شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے زبان کے معاملے میں حساسیت ایک عالمی رجحان ہے۔ اسے ہمارے حکمران نہ سمجھ پائے نہ ہی اس وقت کے دانشوروں نے اس حقیقت کا ادراک کیا۔ دو مختلف زبانوں کے لوگ جب ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو پھر یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔

ہاں خالو جان وہ بھی کہتی ہے کہ ہم بہاری فیملی سے ملنا چاہتے ہیں۔

مزمل ہنس پڑا ہم ایک دوسرے سے اس طرح ملنا چاہتے ہیں جیسے چڑیا گھر کے جانوروں سے انسان ملنا چاہتے ہیں۔(8)

اس صورت حال نے آہستہ آہستہ رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اوپر سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے ساتھ مارشل لاء نے اپنا کام کر دکھایا۔ مارشل لاء دراصل فوج کا اقتدار پر قبضہ نہیں تھا ایک خاص قسم کے طبقے کا تسلط تھا جس میں بنگالی شامل نہیں تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کے زبان اور کلچر پر قبضہ ہو چکا ہے۔ وہ یہ قبضہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب لوگ جو مختلف زبانوں سے تعلق رکھتے تھے ایک دوسرے سے دور ہونے لگے۔ یہاں تک کہ 1965ء جنگ کے بعد اس میں اضافہ ہوتا گیا۔

اس مختصر سی نشست میں جو ظہر کی نماز کے بعد سے عصر کی نماز تک جمع کرتی تھی ہر قسم کے ہی لوگ شامل ہوتے تھے۔ کوئی پابندی بھی نہ تھی۔ کچھ دن پہلے اس محفل میں بہاری بھی ہوتے بنگالی بھی بیٹھتے، کلے میں سانچی پان کی موٹی سی گلوری دباتے پان کی پیک کو تول تول کر اردو بولنے والوں کے علاوہ ہندو بنگالی بھی شامل ہوتے۔ 65ء کی جنگ کے بعد ہندوؤں کی بیٹھک ختم ہوئی۔(9)

یہ حالات کس رخ پر جا رہے تھے۔ اس کو سمجھنے کے لئے زیادہ دانش کی ضرورت نہیں تھی لیکن افسوس یہ دانش ہمارے حکمرانوں اور انتظامیہ کے پاس مفقود تھی۔ نفرتوں کو بھڑکانے میں کئی طرح سے حصہ ڈالا گیا۔ الطاف فاطمہ نے بے حد معروضی طریقہ سے اس کا جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزہ معاشرتی زندگی کی سطح سے دکھایا ہے۔ اس ناول میں وہ طبقے شامل نہیں ہیں جو اس سارے ماحول کے ذمہ دار تھے۔ اس میں عوام کی اپنی جذباتی اور ذہنی کشمکش کی سطح دکھائی گئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی سچائیوں میں روزمرہ زندگی کی کدورتوں کے ذریعے الطاف فاطمہ نے ایک بڑی تصویر بنانے کی کوشش کی ہے۔ مختلف زبانوں کے عمل کے ساتھ قومیتوں کے مختلف اندازِ زیست کے فرق نے بھی نفرت کے بیج بوئے۔ ایک دوسرے کو جب قبول نہیں کیا جاتا تو ان کے مزاجوں اور رہن سہن کے انداز کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ان کو گھٹیا اور نیچ ثابت کرنے کے لئے بہانے تلاش کئے جاتے ہیں۔ ''چلتا مسافر'' میں ہر طرف سے ایک دوسرے کے خلاف جذبات موجود تھے اور یہ ایک ایسی سچائی تھی جس نے ہندوستان کی تقسیم سے جنم لینے والے مسائل کو اور زیادہ تکلیف دہ بنا دیا۔

اللہ کا شکر ہے میری آیا تو اردو اسپیکنگ ہے ورنہ کون سر مارتا امار تمار سے۔ پھر یہ گندے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ بنگالی۔ ذرا دیکھو تو کتنی سڑی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ پاس ہی جوہڑ ہوتے ہیں۔ مکھی مچھر اور چنگڑی ماچھ بس یہی ہے ان کا مقدر۔ ان کی باتیں سن کر سلسبیل آنکھوں میں آنسو آجاتے۔(10)

جب اس سطح پر حالات پہنچ جاتے ہیں تو پھر قوموں کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی وجوہات کے نتیجے میں بڑے بڑے انقلاب برپا ہو جاتے ہیں۔ مغربی پاکستان کی اکثریت اس واقعے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال سے بے خبر تھی کہ اس وقت ایسا میڈیا موجود نہیں تھا اور حکومت کا پریس پر کنٹرول تھا اس لئے اس سانحہ کی کسی کو کان و کان خبر نہ ہو سکی کہ مشرقی پاکستان جو سنہرے ریشے کا سنہری ملک ہے یوں اچانک الگ ہو جائے گا۔ اس سے تو یوں لگتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں اور اشرافیہ کی بے اعتنائی کی وجہ سے ہم خود ہی اسے الگ کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ عام آدمی کی سطح پر بڑے سیاسی فیصلوں کا وقت نہیں آیا تھا نہ ہی سانحہ مشرقی پاکستان کی دگرگوں حالت ابھی رونما ہوئی تھی۔ اس سارے معاملے کو الطاف فاطمہ نے بہت احتیاط اور انسانی رویوں کے مشاہدے کی بنیاد پر لکھا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہاری اور بنگالی میں انسانیت کے رشتوں کے حوالے سے ایک بے حد دل دہلا دینے والی کیفیت کو الطاف فاطمہ نے لکھا ہے۔ اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک بہاری کو ایک نہتی اور مظلوم بنگالی عورت کا کتنا احساس ہے اور وہ اس رشتے کو کس طرح دیکھ رہا ہے۔ ''چلتا مسافر'' کا یہ پہلو تاریخ کے پورے تدریجی عمل کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

'اف' مزمل کے منہ سے کرب کے عالم میں نکلا لیکن.....لیکن تم مجھ سے وعدہ کرو کہ ہاجرہ کی لاش نہیں سڑے گی میں کل نہ جانے کہاں ہوں۔ مولوی منظور الاسلام صاحب' ہاجرہ کی زندہ لاش پر بھی اتنی بوٹی نہیں کہ کسی کتے کی داڑھ گرم کر سکے۔''

وہ آگے بڑھا تو منظور الاسلام نے چپکے سے آواز دی ''شہید شاب' ایک منٹ'' ہاں کیا ہے''۔

''ایک لفظ کہے بغیر اس نے مزمل کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ہاتھ کی پشت پر شبنم کی سی نمی اور تری کا احساس ہوا تو مزمل نے ہاتھ کھینچ لیا۔ چوری چوری دبے قدموں ہاجرو کی بانشا کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کی نمی کا احساس سوال کرتا رہا یہ بھی..... یہ بھی تو بنگالی ہے۔ پھر وہ کون ہیں.....کون ہیں وہ لوگ؟(11)

اس اقتباس کے بعد ہمیں قائل ہو جانا چاہئے کہ اس سانحے کا تعلق عوام کی سطح سے کہیں اوپر کی سطح پر تھا اور ویسے بھی بہت سی کتابوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عوام یا وہاں کے رہنے والوں کا اس میں کوئی کردار نہیں تھا۔ اسی طرح ناول کا کردار بذلل اپنی جذباتی وابستگی کے باعث بنگالی ہوتے ہوئے بھی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مزمل کے بیٹے کو بہاری کیمپ سے نکال کر پاکستان روانہ کرتا ہے تاکہ ان کی اگلی نسل قائم رہ سکے۔ اس حوالے سے الطاف فاطمہ نے جو تاریخی اور تہذیبی بنیاد اس ناول کو فراہم کی ہے اس کا نقادوں نے حق ادا نہیں کیا۔ اس لئے کہ نقادوں کی اپنی اپنی ذاتی ترجیحات رہی ہیں جس نے ناول کی روایت کو کسی حد تک نقصان پہنچایا ہے۔

قومیں جب عاد اور ثمود کے راستوں پر چل پڑتی ہیں تو جانے والے لوٹ کر نہیں آتے۔ تم خود ہی سوچو۔ ہم نے خود ہی تو اپنے درمیانی راستوں پر گہری گہری فصیلیں کھودی ہیں۔''

انہوں نے تو کھودی نہیں جیسے۔''

مگر کدالیں اور پھاوڑے تو ہم نے ہی مہیا کئے اور ان کے ہاتھ میں دیئے۔ اپنے روّیوں کی کدالیں اور پھاوڑے۔(12)

یہاں سے 1971ء کا سانحہ رونما ہو جاتا ہے اور جو کدالیں پاکستان کی انتظامیہ یا حکمران طبقے نے بنگال کے عوام کو فراہم کی تھیں اس کا نتیجہ ظاہر ہونا تھا۔ 1971ء کے بعد بہاریوں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹے کہ نہ وہ واپس ہندوستان میں بہار میں جا سکتے تھے نہ پاکستان آ سکتے تھے۔ اس حوالے سے وہاں بہاریوں کو کیمپ میں رکھا گیا۔ یہ انتہائی تکلیف دہ انسانی مسئلہ تھا جس کی طرف کوئی سنجیدہ کوشش کسی نے نہ کی اور تقسیم ہندوستان کے نتیجے میں یہ قوم بری طرح متاثر ہوئی۔ کیمپ کے حوالے سے ایک اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ انسانی زندگی اتنی ارزاں ہوگئی تھی کہ بہاریوں کا قتل عام اس حد تک تھا کہ مزمل اس بات پر طنزیہ انداز سے سوچتا ہے کہ کوئی شخص قتل ہوئے بغیر بھی مر سکتا ہے؟ اس سے بڑی حقیقت ان کیمپوں کی الطاف فاطمہ کیا دکھا سکتی ہیں۔

کیمپ میں کتنا تھرل تھا۔ ایک اور زندگی سلطان عالم کی بیٹی کے بعد از خود تمام ہوئی۔ نہ کوئی بھالا لگا' نہ کٹار۔ تو اس کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگ مارے نہیں جائیں گے۔ خود بھی مریں گے۔ مر سکیں گے۔'(13)

آج بھی وہ کیمپوں کے اسیر ہیں۔ یہ 1971ء کے بعد کا آشوب ہے جو آج بھی قائم ہے۔ ''چلتا مسافر'' آج شاید لوگوں کو یا عام قاری کو یاد نہ ہو۔ مگر یہ مسئلہ تو آج بھی زندہ ہے۔ کب تک زندہ رہے گا کسی کو معلوم نہیں۔ اردو اخبار ''جنگ'' کی تازہ اشاعت میں ایک کالم عبدالرؤف نے لکھا ہے جس کا عنوان ہے ''بہاری کیمپوں کا مسئلہ''۔ اس کالم میں انہوں نے بنگلہ دیش سے کچھ رپورٹس کے حوالے دیتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ بہاری جنہوں نے 1971ء میں بنگلہ دیشی پرچم کی بجائے پاکستان کا پرچم بلند کیا تھا انہیں آج بھی مختلف شہروں کے کیمپوں میں بے یار و مددگار رکھا گیا ہے۔ انسانی سمگلروں نے ان کی لڑکیوں کو نوکریوں کے لالچ میں اغوا کر کے جسم فروشی پر لگا دیا۔ انہیں مختلف ملکوں کو سمگل کر دیا جاتا ہے۔

8/8 کے خیمہ نما گھروں میں تین لاکھ سے زیادہ پناہ گزین مختلف کیمپوں میں اپنی تیسری نسل کو جوان ہوتا دیکھ رہے ہیں لیکن ان کی ایک بڑی خاصیت یہ بھی ہے کہ تمام محصورین بنگلہ دیش کی بجائے مخصوص بہاری لہجے میں اردو بولنا پسند کرتے ہیں۔ ڈھاکہ سمیت رنگ پور' چٹا گانگ' سید پور' کھلنا اور میمن گنج سمیت راجشاہی میں محصورین کے کیمپس قائم ہیں جہاں موجود ہزاروں پاکستانی خاندان کے تین لاکھ افراد کا ایک بنیادی المیہ یہ بھی ہے کہ ان کی کوئی شناخت نہیں۔(14)

الطاف فاطمہ کا تاریخی شعور آج کی اس صورت حال میں دیکھا جا سکتا ہے کہ 1981ء میں شائع ہونے والا ناول ''چلتا مسافر'' آج 2013ء میں چلنے والے اس ناسور تک اپنی تعبیر دے رہا ہے۔ اس کے بعد کہانی کا ایک کردار اسلام آباد پاکستان آ جاتا ہے جو ناول کے اختتام میں حیرت سے بتاتا ہے کہ سانحۂ مشرقی پاکستان کا غم کسی کو بھی نہیں ہوا۔ کسی نے اس تہذیبی اور ثقافتی طاقت کے کھو جانے پر افسوس تک نہ کیا۔ انتظار حسین نے اپنا افسانہ ''شہر افسوس'' اسی موضوع پر 1972ء میں تحریر کیا۔ وگرنہ صورت حال ایسی رہی کہ بے حسی نے ہر طبقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ناول ''چلتا مسافر'' کا اختتام بے حسی اور غفلت کے اس احساس پر ہو جاتا ہے۔

اسلام آباد واقعی روشنیوں کا شہر ہے..... بڑی شان وشکوہ ہے لوگ ہنستے بولتے ہیں۔خوب رج کر کھاتے پیتے ہیں۔دیس دیس کی چیزوں کی خریداری کرتے ہیں اور خوب خوش رہتے ہیں۔ابو پتا ہی نہیں چلتا کہ اس قوم کیساتھ کوئی حادثہ ہو گیا ہے کسی کا بازو کٹ گیا ہے۔ یہاں پہنچ کر لگتا ہے کہ ہم جس تجربے اور واردات سے گزرے تھے وہ سب ایک وہم اور خیال تھا۔اور جو کچھ بھی جس کے ساتھ ہو گیا وہ تو ایک پریشان خواب ہے یا چند اخبارات کا اسٹنٹ ہے۔(15)

اب جب کہ پُلوں کے نیچے سے پانی کافی گزر چکا ہے۔ یہ مسئلہ بہاری مسلمانوں کے لئے ابھی تک مایوسی اور نا اُمیدی کی گہری دُھند میں لپٹا ہوا ہے۔گزشتہ دنوں عالمی پریس اور بنگلہ دیشی پریس میں کئی رپورٹیں شائع ہوئیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی ان کی ہمت پست نہیں ہوئی اور وہ کسی ان دیکھی انجانی قوت کے انتظار میں ہیں جو اُن کو اس تاریخ کے جبر سے آزاد کرائے۔ انہی کیمپوں میں رہتے ہوئے ایک بہاری نوجوان نے اپنی میڈیکل کی تعلیم مکمل کی ہے۔آج الطاف فاطمہ کے اس ناول نے ایک نئی تعبیر حاصل کی ہے کہ تاریخ کے تسلسل میں انسانی آشوب ایک نئی تاریخ کو جنم دے دیتا ہے۔''چلتا مسافر'' ہندوستان کی تقسیم سے پیدا ہونے والے تنازعات میں سے ایک ہے جو مسئلہ کشمیر کی طرح ایک حقیقت ہے۔اردو ناول کی روایت میں اس مسئلے پر لکھا جانے والا یہ ناول اُس تخلیقی اور تاریخی شعور کی علامت کے طور پر دیکھا جانا چاہئے جس کا اظہار ہمیں پوری روایت میں ملتا ہے۔اس سے ہمیں اس بات کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے کہ تاریخی صداقت کس طرح ناول میں آسکتی ہے اور تاریخی مزاج کے ساتھ تاریخی اور تہذیبی مسائل ناول میں کیسے جگہ بنائیں گے کہ یہ دو مختلف میڈیم ہیں اور ایک دوسرے کو کیسے قبول کریں گے۔ یہاں ہمیں شمیم حنفی نے ایک تعبیر دی ہے۔جس کی روشنی میں ہم ''چلتا مسافر'' پر کی جانے والی بحث کو مکمل کریں گے۔

ناول کی صنف جسے ایک لکھنے والے نے کسی شہر کی منصوبہ بندی کا عمل کہا تھا۔ہم اسی عمل کی نوعیت میں لکھنے والے سے روشناس ہوتے ہیں۔شہر کے حدود میں داخل ہونے کے بعد اس سے نکلنے کا راستہ حسب توفیق قاری خود تلاش کرتا ہے۔ یہ کام ناول کے مصنف کا نہیں وہ شہر کا خاکہ بھی بنائے اور یہ بھی بتائے کہ اس شہر میں داخل ہونے اور اس سے نکلنے کے راستے کیا ہیں۔تخلیقی تجربے کے انہی بھیدوں کی بنیاد پر تو تاریخی صداقت اور فنی یا تخلیقی صداقت کے بیچ فرق کی لکیر کھنچ جاتی ہے۔(16)

حوالہ جات

1- ڈاکٹر مبارک علی، ''تاریخ اور فلسفۂ تاریخ''، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور۔2010ء۔ص:139

2- R.G Collingwood, "The Idea of History" Oxford University Press-India Edition. 2007- P:10

3- الطاف فاطمہ، ''چلتا مسافر''، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔ 1ء۔ص:55

4- ایضاً۔ص:125

5- ایضاً۔ص:64

6- ایضاً۔ص:164

7- ایضاً۔ص:177

8- ایضاً۔ص:163

9- ایضاً۔ص:168

10- ایضاً۔ص:151

11- ایضاً۔ص:242

12- ایضاً۔ص:212

13- ایضاً۔ص:314

14- عبدالرؤف، کالم، روزنامہ جنگ، لاہور۔22 دسمبر 2013ء۔ص:8

15- الطاف فاطمہ، ''چلتا مسافر''، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔1981ء۔ص:317

16- شمیم حنفی، ''تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ'' سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ 2006ء۔ص:22,23